حکمتِ اقبال (۳۱)
ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور سائنس

سائنسی تحقیق کا اصل ماخذ

مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ تمام سائنسی علوم کی بنیاد ہے۔ مشاہدۂ قدرت کے لیے دنیا میں سب سے پہلی مؤثر آواز جو بلند ہوئی وہ قرآن حکیم کی آواز تھی، جس کا ارشاد یہ تھا کہ مظاہرِ قدرت خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں، کیونکہ ان میں خدا کی صفات جلوہ گر ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے اپنے خالق کو پہچانے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے سائنسدان جنہوں نے سائنسی طریقِ تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی مسلمان تھے۔ ان کا مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت خدا کی معرفت کے لیے تھا۔ لہٰذا خدا کا عقیدہ ان کی سائنس کا مدار اور محور تھا۔ علم و حکمت کے میدان میں قدیم اہلِ یونان کے کمالات مسلّم ہیں، لیکن یونانی حکماء مشاہدۂ قدرت کو نظر انداز کر کے اپنا سارا زور فقط خیالات اور تصورات پر صرف کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ سائنسی طریقِ تحقیق کے موجد بن سکتے۔ اس سلسلہ میں اقبال لکھتا ہے:

> "یہ بات قطعاً غلط ہے کہ تجرباتی طریقِ تحقیق یورپ کی ایجاد ہے ۔ ۔ ۔ یورپ نے اس بات کا اعتراف کرنے میں بڑی دیر کی ہے کہ اس کے ہاں کے مروج سائنسی طریقِ تحقیق کا اصل ماخذ اسلام ہے۔ تاہم اس بات کا مکمل اعتراف ہو کر رہا ہے۔"

اس کے بعد اقبال برفال (Briffault) کی کتاب "تعمیرِ انسانیت" (The Making of Humanity) سے کچھ عبارتیں اس بات کے ثبوت میں نقل کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی فلسفہ کے اثر سے مسلمان عرصۂ دراز تک رُوحِ قرآن سے غافل رہے لیکن بالآخر

© rasailojaraid.com

انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اقبال لکھتا ہے :

"سقراط کے صحیح شاگرد کی حیثیت سے افلاطون حسّی تجربات سے جو اس کے خیال میں سچے علم کی طرف نہیں بلکہ فقط کسی رائے کی طرف راہنمائی کرتے تھے، نفرت کرتا تھا کس قدر مختلف ہے یہ نقطۂ نظر قرآن سے جو سُننے اور دیکھنے کی قوتوں کو خدا کے نہایت ہی قیمتی انعامات سمجھتا ہے اور ان کو اس دنیا میں اپنی اپنی کارکردگی کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کا مطالعہ کرنے والے مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کے اثر کی وجہ سے شروع میں بالکل نہیں سمجھا۔ وہ قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے تھے۔ انہیں یہ حقیقت سمجھنے کے لیے (اور وہ بھی پوری وضاحت سے نہیں) کہ قرآن کی رُوح دراصل یونانی فلسفہ سے متعارض ہے دو سو سال سے بھی اُوپر لگ گئے۔ اور پھر اس حقیقت سے روشناس ہونے کا نتیجہ ایک قسم کی ذہنی اور علمی بغاوت میں رونما ہوا جس کی پوری اہمیت آج تک نہیں سمجھی گئی"۔

"لیکن قلبی واردات انسانی علم کا فقط ایک ذریعہ ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے علم کے دو اور ذرائع بھی ہیں یعنی قدرت اور تاریخ! (آگے چل کر اقبال تاریخ کو بھی قدرت میں شمار کر لیتے ہیں، کیونکہ تاریخی واقعات بھی انسانی دنیا میں قدرت کے مظاہر ہیں۔ مصنّف) اور جب قرآن علم کے ان سرچشموں سے کام لیتا ہے تو اس کی حقیقی رُوح پُوری شان و شوکت سے بے نقاب ہوتی ہے۔ قرآن سورج اور چاند میں، سایوں کے دراز ہونے میں، رات اور دن کے تغیرات میں، انسانوں کے الوان اور السنہ کے اختلافات میں، دولت مندی اور مفلسی کے ایام کی گردش میں، غرضیکہ قدرت کے ان تمام مظاہر میں جو انسان کے حواس کے رُوبرو جلوہ افروز ہیں، حقیقتِ مطلقہ کے نشانات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور مسلمان کا یہ فرض ہے کہ ان نشانات پر غور و فکر کرے اور ان سے اس طرح سے نہ گزر جائے کہ گویا وہ بہرا اور اندھا ہے۔ کیونکہ جو شخص اس دنیا میں ان چیزوں کو نہیں دیکھتا، وہ اگلی زندگی کے حقائق کی طرف سے بھی اندھا رہے گا۔ مطالعۂ قدرت کی یہ دعوت اس حقیقت کے تدریجی انکشافات کے ساتھ مل کر قرآن کی تعلیم کے مطابق کائنات اپنی اصل کے اعتبار

d.com

سے متحرک اور محدود اور ترقی پذیر ہے آخر کار یونانی فلسفہ کے ساتھ (جس کا مطالعہ مسلمانوں نے اپنے دَور کی ابتدائی منزلوں میں نہایت ذوق وشوق سے کیا تھا) مسلمان مفکرین کے تصادم کا باعث ہوئی۔ یہ نہ جاننے کی وجہ سے کہ قرآن کی رُوح دراصل فلسفۂ یونان سے متصادم ہوتی ہے اور یونانی فلسفہ پر اعتماد کرنے کی وجہ سے ان کا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ وہ فلسفۂ یونان کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں۔ رُوحِ قرآن کی حقائق پسندی کے پیشِ نظر اور یونانی فلسفہ کی خیال پرستی کی وجہ سے، جو تصورات سے شغف رکھتا تھا اور حقائق کو نظر انداز کرتا تھا، اس قسم کی کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوائے اور کیا ہوسکتا تھا۔ اس ناکامی کے بعد جو کچھ ہوا وہی ہے جس نے اسلامی تہذیب کی حقیقی رُوح کو آشکار کیا اور تہذیبِ حاضر کے بعض نہایت اہم عناصر کی بنیاد قائم کی"۔

مسلمان سائنس کے موجد اس لیے بنے تھے کہ ان کے سامنے قرآن حکیم کا یہ ارشاد تھا کہ خدا کی معرفت کے لیے قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ لہٰذا خدا کا عقیدہ ان کی سائنس کا مرکزی یا بنیادی تصوّر تھا۔

عیسائیت کا نقطۂ نظر

جب اُندلسی مسلمانوں کے سیاسی حالات نے پلٹا کھایا اور وہ اُندلس سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس یورپ کے اُن لوگوں کے ہاتھ آئی جو جدید عیسائیت کے پیرو تھے۔ چونکہ ان لوگوں نے نادانی سے فرض کرلیا تھا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں ——— ایک پاک اور مقدّس ہے اور دوسری ناپاک اور غیر مقدّس ——— لہٰذا انہوں نے سمجھا کہ کائنات کے مشاہداتی علم کو جسے سائنس کہا جاتا ہے، خدا سے کوئی تعلّق نہیں۔ سائنس اور سائنسدانوں سے کلیسا کی گہری اور آشکار دشمنی نے اس فرضی عقیدہ کے لیے مزید ثبوت بہم پہنچایا۔ اور کلیسا اور ریاست کے افتراق نے جو دونوں کے شدید اور طویل جھگڑوں کے بعد ایک اٹل حقیقت کے طور پر رونما ہوا تھا اس عقیدہ کو مزید تقویت پہنچائی اور اس کے لیے راستہ صاف کیا۔ لہٰذا اس عقیدہ نے جامۂ عمل پہنا اور سائنس سے خدا کا نام خارج کردیا گیا۔ یہ کلیّتِ وجود میں تفرلق پیدا

© rasailojaraid.c

کرنے اور حقیقتِ کائنات کو دو مختلف حصّوں میں تقسیم کرنے کی ایک نامعقول اور افسوسناک جسارت تھی، جس کے پیچھے کوئی عقلی، علمی یا سائنسی دلیل یا شہادت موجود نہ تھی۔ تاہم سائنس کی بے خدائیت کا عقیدہ جو اس طرح عیسائیت کے بطن سے پیدا ہوا تھا، عیسائی مغرب کی دنیا میں جڑ پکڑ گیا۔ ظاہر بات ہے کہ سائنس میں اس عقیدہ کے جاگزیں ہونے کے بعد کوئی ایسے سائنسی نظریات پیدا نہ ہو سکتے تھے جو اس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ لہٰذا ایسے سائنسی نظریات وجود میں آنے لگے جو دراصل اسی کی پیداوار تھے، لیکن جن کو آسانی سے اس کا ثبوت سمجھا جا سکتا تھا۔ ایسے سائنسی نظریات میں ہم انیسویں صدی کی طبعیاتی مادیت اور میکانیت اور ڈارون کے مادی اور میکانکی نظریہ ارتقاء کو شمار کر سکتے ہیں، جنہوں نے اس خیال کو بظاہر ایک سائنسی حقیقت کا درجہ دیا کہ قدرت میں کوئی تخلیقی یا رادہ نما قوت کارفرما نہیں اور خدا کا عقیدہ مظاہرِ قدرت کی تشریح کے لیے غیر ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ بھول گئے کہ سائنس کی بے خدائیت درحقیقت ایک مذہبی عقیدہ ہے جس کو عیسائیت نے جنم دیا تھا اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ خود سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے۔ اب بھی عیسائی مغرب کے سائنسدان یہ کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ اپنی سائنس کو ہر حالت میں اس راستہ سے بچائیں جو خدا کے عقیدہ کی طرف جاتا ہے۔ اور خواہ کچھ ہو جائے اس کو سختی کے ساتھ اس چار دیواری میں بند رکھیں جو سائنس کی بے خدائیت کے نامعقول عقیدہ نے اس کے ارد گرد بنا رکھی ہے۔

مظاہرِ قدرت آیات اللہ ہیں

ان کی روش سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے خدا اور مذہب کے خلاف ایک سازش کر رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ایسے حقائق کو نظر انداز کرتے ہیں جو قدرت میں کسی ذہنی یا تخلیقی قوت کے عمل کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوں، خواہ وہ ثبوت کیسا ہی بیّن اور آشکار کیوں نہ ہو۔ مثلاً وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ قدرت میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جو کسی ذہن کی تخلیقی کارروائی کا پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً ترتیب، تنظیم، تجویز، تعمیر، تکمیل، وحدت، یکسانیت، تسلسل، مقصدیت، تطابق، توافق، ریاضیاتی فکر اور زندہ حیوانات کی خودکارانہ نشوونما، جو ان کو برتر اور بلند تر مدارجِ حیات

کی طرف خود بخود لے جاتی ہے۔ اگر یہ اوصاف قدرت کے اندر موجود نہ ہوتے تو قدرت میں کسی چیز کا وجود ہی نہ ہوتا اور طبعیاتی اور حیاتیاتی علوم ممکن نہ ہوتے۔ اس کے باوجود مغرب کے سائنسدان ان کے وجود سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی تشریح نہیں کرتے، کیوں کہ سائنس کی بے خدائیت کے مفروضہ کو تسلیم کرنے کے بعد وہ ان کی کوئی تشریح کر ہی نہیں سکتے۔ اگر وہ بعض وقت ان میں سے بعض حقائق کی تشریح کے لیے سخت مجبور ہو جائیں تو پھر بھی ان کی تشریح کے لیے خدا کے تصوّر کو کسی حالت میں بھی استعمال نہیں کرتے، بلکہ کچھ من گھڑت فرضی مابعد الطبعیاتی تصوّرات کو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے کچھ حقائق کی تشریح کے لیے جیمز جینز کسی ریاضیاتی ذہن کو فرض کرتا ہے، برگساں کسی قوتِ حیات کا نام لیتا ہے۔ اور ڈریش کسی عالمی اسکیم یا انٹی لیچی کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ تمام مفروضات فرضی ہونے کے علاوہ ناکافی اور ناتسلّی بخش ہیں۔ مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات میں کوئی اعلیٰ درجہ کا ریاضیاتی ذہن تو کارفرما ہو لیکن اس میں شخصیّت کے اور اوصاف جو جذبات اور اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں موجود نہ ہوں؟ یا قدرت میں کوئی ایسی قوّت اجسامِ حیوانات کی تخلیق اور تکمیل کے کاموں میں مصروف ہو جو سوچتی سمجھتی ہو، اپنے مقاصد سے آگاہ ہو، اور ان کو حاصل کرنے کی قدرت رکھتی ہو، لیکن ایک کامل شخصیّت نہ ہو؟ ہمارا تجربہ اس قسم کے ادھورے تصوّرات کی نفی کرتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضیاتی فکر یا مقصدیت کے اوصاف جس وجود میں پائے جاتے ہوں وہ شخصیّت کے باقی ماندہ جذباتی اور اخلاقی اوصاف سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا معقولیّت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ قدرت میں جو ریاضیاتی ذہن یا قوتِ حیات کارفرما ہے وہ خودیٔ عالم یا خدا ہی ہے لیکن سائنس کی بے خدائیت کا غیر عقلی عقیدہ مغرب کے سائنسدانوں کو یہ بات سمجھنے سے مانع ہے۔

علم کی نیامِ بے شمشیر

سائنس کی بے خدائیت پر اقبال بڑے افسوس کا اظہار کرتا ہے اور پُر درد الفاظ میں کہتا ہے:

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

© rasailojaraid.com

اس شعر میں اور اس قسم کے دوسرے اشعار میں علم سے اقبال کی مراد سائنس ہے اور دوسرا کوئی علم نہیں چنانچہ وہ خود اپنے ایک خط میں لکھتا ہے :-

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت ہے یہ علم ! علم حق کی ابتدا ہے۔"

اقبال کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عشق الٰہی کی تیغ جگردار سائنس کی نیام کے اندر اپنی جگہ پر موجود تھی اور بعد میں یہ افسوسناک حادثہ پیش آیا کہ کسی نے اس تلوار کو جو دنیا بھر کے تمام باطل تصورات اور نظریات کاٹ کر رکھ سکتی تھی اس نیام سے اڑا لیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نیام اب تک خالی پڑی ہے۔ یہ تیغ جگر دار کیسے اڑ گئی اور کس نے اڑائی ؟ اقبال اس سوال کا جواب اپنے اشارہ کو بلیغ اور موثر بنانے کے لیے سننے والوں پر چھوڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اقبال سائنس کی بے خدائیت کے اس تاریخی پس منظر کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی تشریح اُوپر کی گئی ہے۔ اس تیغ جگر دار کو اُڑانے کی ساری ذمہ داری مغرب کی کوتاہ اندیشی اور مسلمان سائنسدانوں کی کورانہ تقلید پر عائد ہوتی ہے۔

علم حق کا پہلا مرحلہ

اگرچہ بے خدا سائنس الفاظ میں نہیں کہتی کہ خدا موجود نہیں، لیکن انسان اور کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ اور اس کا طریق فکر و عمل ایسا ہے کہ گویا خدا موجود نہیں۔ وہ تمام طبعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس طرح سے کرتی ہے کہ گویا ان کا کوئی خالق نہیں اور اگر ہے تو ان کے ساتھ اب اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس کی صفات کا کوئی نشان اُن کے اندر موجود نہیں۔ اس طرح سے مغربی سائنس اس ایک ہی دروازہ کو بند کر دیتی ہے جس کی راہ سے خدا کی معرفت کا نور سب سے پہلے حضرت انسان تک پہنچتا ہے۔ اقبال کا یہ خیال قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے کہ خدا کی معرفت اور محبت کو بیدار

کرنے کا پہلا ذریعہ انسان کے حواس ہیں، جن کی مدد سے وہ مظاہرِ قدرت میں خدا کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر ہم خالق، ربّ، رحیم، کریم، عادل، حفیظ، علیم، سمیع، بصیر، مومن اور مہیمن ایسے الفاظ کے معنی نہیں سمجھ سکتے جو اوصافِ باری تعالیٰ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو سمجھنے کے بغیر خدا کی معرفت و محبّت یا اطاعت و عبادت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے قرآن حکیم کا سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لیے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرے۔ حواس کے بعد خدا کی معرفت کا دوسرا ذریعہ ذکر ہے، جس کی مدد سے پھر انسان قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر اور مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر بھی خدا کی صفات پر غور و فکر کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے وہ قدرت کے مشاہدہ سے ان الفاظ کے معنی سمجھ چکا ہوتا ہے جو خدا کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اس ذکر کی کثرت سے خدا کے حضور یا قرب کا احساس پیدا ہوتا ہے اور یہ احساس قلب کی ایک کیفیت ہے جو عشق یا محبّت سے تعلق رکھتی ہے اور شعور اور ادراک سے بالا ہے۔ اقبال نے اس مطلب کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

علمِ حق اوّل حواس، آخر حضور
آخرِ اُو مے نگنجد در شعور

ایک اور جگہ اقبال ذکر اور فکر کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:-

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَاء
مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطّار
مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربیّ الاعلےٰ

© rasailojaraid.c

علمِ بے عشق کے خطرناک نتائج

بے خدا سائنس خدا کا انکار کرنے کے بغیر خدا کو نظر انداز کرتی ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کو بھی اس طرح سے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ گویا خدا موجود نہیں۔ اور یہ نقطۂ نظر خدا کے انکار سے بدتر ہے۔ بے خدا سائنس نے ہی اس نامعقول اور بے بنیاد عقیدہ کو رواج دیا ہے کہ معیاری فلسفہ وہی ہے جس میں خدا ایک حقیقت کے طور مذکور نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں کائنات کے جس قدر فلسفے پیدا ہوئے ہیں ـــــ مثلاً ڈارونزم، مارکسزم، میکڈوگلزم، فرائڈزم، ایڈلرازم، بی ہیویرازم، لاجیکل پازیٹوزم، ہیومنزم وغیرہ ـــــ وہ سب بے خدا ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں انسانی فطرت اور انسانی افعال و اعمال کے جس قدر نظریات وجود میں آئے ہیں وہ بھی سب کے سب بے خدا ہیں۔ مثلاً بے خدا فلسفۂ سیاست، بے خدا فلسفۂ اخلاق، بے خدا اقتصادیات، بے خدا قانون، بے خدا فلسفۂ تعلیم، بے خدا فلسفۂ تاریخ، بے خدا نفسیاتِ فرد اور بے خدا نفسیاتِ جماعت۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہونا کوئی معمولی سا معصوم سا اور بے ضرر سا حادثہ نہیں جو صرف کتابوں میں ہی رونما ہوا ہو۔ اس نے انسان کی کتابوں کو ہی نہیں بدلا، بلکہ اس کے مقصدوں، قدروں، منصوبوں، امیدوں، آرزوؤں اور حق و باطل، خوب و زشت اور نیک و بد کے پیمانوں اور معیاروں کو بدل کر اس کے اعمال و افعال کو بھی بدل ڈالا ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ جو کچھ سوچتا ہے وہی کرتا ہے۔ اگر اس کے افکار و آراء اور تصوّرات و نظریات بے خدا ہوں تو پھر اس کے اعمال و افعال کا بے خدا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہوجانا عالمِ انسان کا بہت بڑا حادثہ ہے جس نے تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے۔ اسی کی وجہ سے اب دنیا میں کوئی ایسی ہمہ گیر اخلاقی اور رُوحانی قوّت باقی نہیں رہی جو اندر سے انسانی اعمال کو ضبط میں لا کر صحیح راستہ پر ڈال سکے۔ یہی حقیقت ہے جو دورِ حاضر کے انسان کی تمام بدقسمتیوں اور پریشانیوں کا موجب ہے۔ مثلاً آزاد جنسیت کی وجہ سے عائلی زندگی کا بگاڑ، طفولیتی بے راہ روی، علم اور استاد کے احترام کا زوال اور علمی درسگاہوں کے ضبط و نظم کا فقدان، اقتصادی خوشحالی کے باوجود اطمینانِ قلب سے محرومی، ذہنی بیماریوں، خودکشیوں

اور جرموں کی روز افزوں تعداد، سیاست دانوں کے جھوٹ اور فریب، سیاسی سازشیں اور ان سے پیدا ہونے والے سیاسی قتل اور سیاسی انقلابات، قومی اور بین الاقوامی معیارِ اخلاق کی پستی، میزائیلوں اور ایٹم بموں کے چڑھتے ہوئے انبار، عالمگیر جنگوں کا ایک سلسلہ جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر سائنس باخدا ہو جائے تو یہ سب مفاسد اور مصائب ختم ہو جائیں اور آسمان کے نیچے ایک ارضی جنت وجود میں آ جائے۔

سائنس اور عشق کی گفتگو

اقبال نے اس مضمون کو سائنس اور عشق کی ایک گفتگو کی صورت میں بیان کیا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ میری نگاہ پوری کائنات کی راز دار ہے اور زمانہ میری کمند میں گرفتار ہے، میری آنکھیں اس مادی کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں، مجھے آسمان سے اُس طرف کی دنیا یعنی عالمِ مابعد الطبعیات سے کوئی سروکار نہیں، میرے ساز سے سینکڑوں نغمے بلند ہوتے ہیں اور میں اپنے دریافت کیے ہوئے رازہائے سربستہ کو سرِ بازار لے آتی ہوں تاکہ ہر شخص ان کو پرکھ سکے اور ان سے مستفید ہو سکے۔

نگاہم رازدارِ ہفت و چار است　　گرفتارِ کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سو باز کردند　　مرا با آں سوئے گردوں چہ کار است
چِکد صد نغمہ از سازے کہ دارم　　ببازار افگنم رازے کہ دارم

عشق جواب دیتا ہے کہ تمہاری افسوں گری سے سمندر شعلہ زار بنے ہوئے ہیں (مراد بحری جہازوں کی گولہ باری سے ہے) ہوا آگ برساتی ہے (مراد ہوائی جہازوں کی بم باری سے ہے) اور زہر آلود ہے (زہریلی گیس کی طرف اشارہ ہے۔ جب تک میرے ساتھ تیری دوستی تھی تو ایک نور تھی۔ مجھ سے الگ ہونے کی دیر تھی کہ تیرا نور آگ بن گیا۔ تو روحانیت کے خلوت خانہ میں پیدا ہوئی تھی (مراد یہ ہے کہ مسلمانوں نے تجھے خدا کی معرفت کی جستجو میں ایجاد کیا تھا) لیکن تو شیطان کے جال میں پھنس گئی (یعنی خدا کے تصوّر کو ترک کرنے اور باطل تصورّاتِ حقیقت کو اپنانے کی وجہ سے)۔ آ ہم دونوں مل کر اس خاکی کائنات کو گلستان بنائیں۔ آسمان کے

© rasailojaraid.c

نیچے ایک ایسا بہشت بنائیں جو ہمیشہ قائم رہے۔ آ میرے دردِ دل سے ایک ذرّہ لے لے (یعنی خدا کے عقیدہ کو قبول کرلے) اور اس جہانِ پیر کو پھر جوان بنادے۔ ہم روزِ ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اور ایک ہی نغمہ (یعنی خدا کی محبّت کے نغمہ) کے زیر و بم ہیں:

زافسونِ تو دریا شعلہ زار است — ہوا آتش گداز و زہر دار است
چو بامن یار بودی نور بودی — بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی — ولیکن در نخِ شیطاں فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز — تہِ گردوں بہشتِ جاوداں ساز
روزِ آفرینش ہمدم استیم — ہماں یک نغمہ را زیر و بم استیم

جب انسان کے تمام اعمال کی قوّتِ محرکہ خدا کی محبّت ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا جو کام بھی خدا کی تسکین اور تشفی کے لیے نہ ہو گا محض بے سود ہو گا۔ سائنس اگر خدا سے بے تعلّق ہو گی تو وہ بیکار خیالات کا تماشہ خانہ ہو گی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

علم کور از عشق برخوردار نیست — جز تماشہ خانۂ افکار نیست

بلکہ ایسی سائنس چونکہ سچّے تصوّرِ حقیقت سے کٹ جاتی ہے وہ لازماً کسی جھوٹے تصوّرِ حقیقت پر مبنی ہو جاتی ہے۔ اس سے شیطانی قوّتوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور انسان کے اصلی مقاصد کو نقصان پہنچتا ہے:

علم بے عشق از طاغوتیاں — علم با عشق از لاہوتیاں

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔